باب ۹

یا حیُّ یا قیُّوم

تجریدی رنگ و توحیدِ اُولیٰ

حیاتِ کُل تجرید میں حیُّ کا رنگ ہے۔ یہ لاتعین ہے۔ لازمان لامکان کی بات ہے۔ یہ الحیات، حیاتِ کل صرف تجریدی رنگ میں ہی اپنائی جاسکتی ہے جیسے روشنی کے تجریدی روپ شمع، چاند، سورج وغیرہ ہیں اسی طرح حیات کے بے شمار تجریدی روپ ہیں۔ مگر ان تجریدی روپوں سے ماوراء روشنی ایک علیحدہ چیز ہے۔ اسی طرح حیات ایک علیحدہ چیز ہے۔ یہ ایسی بھی بات نہیں کہ سمندر ہے، سمندر میں قطرے ہیں یا سورج ہے اور اس کے کئی طبق ہیں۔ اس مثال سے بھی تعین ہوتا ہے۔ حیُّ تو لاتعین والی بات ہے۔ حیُّ کی تجلی ہی حیات ہے۔ ''فانفخت فی الروح'' بھی حیُّ کی تفسیر ہے۔ یوں روح اور تنفس بھی ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں بھی کہیں کہیں ان ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

اور قیوم وجود کے اعتبار سے جس کا قیام الحیات میں ہو۔ یہ بھی وجود سے ماوراء لاتعین کی بات ہے اور ایسی اٹل چیز ہے کہ اس میں کبھی بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ باقی تعینات میں ہر چیز میں تبدیلی ہے۔ مگر اس اٹل حیات کے قانون میں، حیُّ میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ قیوم وہ ہے جس کا قیام الحیات میں ہو، اٹل ہو۔ یہ توحیدِ اولیٰ میں بسنے کی بات ہے۔ یہ ایک عشق بس جاتا ہے۔ جب پھوٹ پھوٹ کر نکلے تو نہ کوئی عاشق، نہ کوئی محبوب، نہ کوئی

دوئی ۔ ایک دائم سہاگ کی کیفیت ۔ یہ باری تعالیٰ کی وہ ظہور کی آن اور شان ہے کہ کہیں وہ ہی وہ ہے، اور کچھ نہیں ۔ یہاں نہ آرزو کا سوال، نہ تمنا کا، نہ دوری کا۔ ان سب سے نجات، ایک وصالِ دائم کی کیفیت، ایک ایمان بالغیب کی لذت، ایک توحیدِ اُولیٰ کا رنگ ۔

فتحِ غیب

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حیُّ یا قیُّوم '' کچھ فقراء نے بسم اللہ کی فتح حاصل کی ہے کچھ ہیں جنہوں نے حیُ وقیُّوم کی اور کچھ نے دونوں پر ۔ حقیقتاً بسم اللہ تو بسم اللہ ہے ہی ۔ اس کی فتح کے بغیر ایسا لگتا ہے کہ کوئی اور فتح ممکن نہیں ۔غوث پاک نے جو فتح الغیب کہا ہے یہ فتح اہم ہے ۔ فتح کے معنی کھلنا اور انجام حیرانی ۔ وہ معراج میں بھی ہو ل، عالمِ تحیر اور اس کیفیت میں ''اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلوٰةُ وَالطَّيِّبَات'' یہ مقامِ حیرت ہے، بے بسی نہیں ۔ یہ وہ تحیر ہے جو حیُ کی یعنی امنڈتی ہوئی زندگی کی نشانی ہے اور بچوں میں فطری طور پر ہوتی ہے ۔ زمان پر فتح کی وجہ سے اس حیرانی کا تعلق قیّوم سے ہے ۔ اس میں ایک ٹھہراؤ ہے اسی کیفیت کے لئے کہا گیا ہے ۔

زیرکی بفروش وحیرانی بخر　　زیرکی ظن است وحیرانی نظر

''چالاکی بیچ دے اور حیرانی خرید لے ۔ چالاکی ایک اندازہ ہے اور حیرانی اصل نظر ہے''

یہ نظر یَنظُرُ بِنُورِ اللہ ہے ۔ سنّت الٰہی ہے، شعارُ اللہ ہے ۔ قوانین فطرت سے بہت بلند چیز ہے ۔ فطرت پر حاوی و ساری ہے ۔

حیُّ و قیُّوم پر فتح کے معنی ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت علیؓ نے

حضرت حسنؓ سے کہا تھا کہ تم اُمُ الکتاب ہو۔ ایک تو یعنی کتاب ہے اور وجودی پیرایہ میں ام الکتاب ہے۔ اسی طرح یا حیُّ یا قیُّوم اپنے ہی اندر عرفانِ حقیقت ہے۔ ہم اگر وجود کے مکانی تصورات میں گھرے ہوں تو جتنا قُرب ہوگا اتنا ہی بُعد۔ مگر لازمان لامکان کی حالت میں وہ عرفان معراج کی شان بن جائیگا۔ ''رَائیتُ رَبّی بِرَبّی'' (دیکھا رب کو رب سے) وہ ''مَازَاغَ الْبَصَر'' آنکھوں کی ٹھنڈک۔ اسی لئے روح کا ذکر بس دیدار ہے۔ وجود کے گھونگٹ کے پٹ کھلیں تب ہی محبوب ملتا ہے۔ ساری بات یہی ہے۔ ''مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا'' (مر جاؤ مرنے سے پہلے) کے بعد انسان کا قیام الحیات میں ہو جائے تو گھونگٹ کے پٹ کھلتے ہیں۔ البتہ وجودی پیرایہ سے ماورا الماورا ہے۔ اسی لئے اللہ سے محبت کیسے کی جاسکتی ہے۔ روشنی سے محبت کرنہیں سکتے۔ البتہ چراغ، چاند، سورج سے ہوسکتی ہے۔ اللہ سے محبت کا رمز، معراج کے واقعہ سے کھلتا ہے۔ ظاہر باطن کی اکائی۔ اپنی ذات کے آئینہ میں ذات کا دیدار کوئی دوئی نہیں ''رَائیتُ رَبّیِ بِرَبّی'' (دیکھا رب کو رب سے) اسمائے الٰہی میں سے کسی کو اپنائے بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسا مزہ جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھ رہا ہو۔ تلوار کی دھار پر چلنا آسان ہے۔ یہ کانٹے کی نوک پر رقص کرنے والی بات ہے۔ جس نے شادی کر لی، دائم الصلوۃ ہوا۔ جس نے صحیح کلمہ پڑھ لیا قائم الصلوۃ ہوا۔ جس نے کسی اسم کو اپنا لیا وہ خود وہ اسم ہوا۔ انسان اپنے مقام کو پالے تو جو وسعت اور انبساط اسے ملتا ہے وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ یہ پکی چیز ہے آنی جانی نہیں۔

''یا حیُّ یا قیُّوم. حیُّ و قیُّوم'' میں ایک کرسٹل کے بننے کا سارا راز آجاتا ہے۔ ایک مخصوص مقدار کے محلول میں، ایک چھوٹا سا کرسٹل ڈال دیا

جائے تو اس کے گرد خوبصوت بڑا سا کرسٹل بن جاتا ہے اور پھر سارے ہی محلول میں خوشنما کرسٹل بن جاتے ہیں۔ بات بس مرکز بن جانے کی ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حیُ و قیُوم" کے تجریدی رنگ کو وجودی پیرایوں میں اترنا ہے۔ "فَاَنْفَخْتُ فِی الرُّوْح" ہو جائے تو فتح کے دروازے کھل جائیں گے۔ اللہ سے محبت اور اتباعِ سنّت میزان کی راہ ہے۔ ٹھیک ہے مگر انجام نہیں۔ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایمان کی بات ہے۔ مومن ہو نہیں سکتا جب تک اپنی جان سے زیادہ انہیں نہ چاہے۔ والہانہ پن اور سپردگی صرف عشق سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جو چیز بھی عشق سے دور کرتی ہے، چاہے ریاضتیں ہوں، چلے ہوں، رشد و ہدایت ہو وہ سب حجابات ہیں۔ ان میں کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے خواہ دنیا، خواہ عقبیٰ۔

حقیقتِ عشق

اس کے علاوہ عشق کچھ حاصل کرنا نہیں جانتا۔ سب کچھ نثار کرنا جانتا ہے۔ سب کچھ سپرد کرنا چاہتا ہے۔ خشیتِ اللہ میں سرشاری، عشق ہی کو نصیب ہے۔ عشق کے آنسو، خشیت اللہ کی بات ہے۔ یہ خوف والی بات نہیں بلکہ خوشنودی اور رضا ڈھونڈنے کی بات ہے۔ عاجز ایک عاشق ہی ہو سکتا ہے۔ ہوش کی دنیا تک آنسو اور عجز کے سوا کسی چیز میں صداقت نہیں ہو سکتی۔ عاشق کے لئے سب کچھ محبوب تک رسائی ہے اسی لئے طوافِ کعبہ پھر مدینہ۔ پہلے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ پھر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ" بغیر اس والہانہ عشق کے بات نہیں بنتی۔ اسلام کا نظریہ بھی تسلیم و رضا کا ہے۔ محبوبؐ سے تسلیم و رضا والے کو ورد وظائف، عمل عملیات کے ذریعہ قوتیں حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ وہ تو اس

تسلیم و رضا میں اسی رنگ میں رنگا ہوتا ہے جسے اس نے تجریدی رنگ میں پا لیا ہوتا ہے۔ جس پر ان تجلیات کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو وہ جو کہتا ہے یہ وجود نہیں کہتا۔ سبحان اللہ اس میں سے محبوبؐ ہی بول رہا ہوتا ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حیُّ یا قیّوم"

حیُّ و قیُّوم تو ایک دائم وصال کی کیفیت ہے۔ دائم سہاگ کی کیفیت ہے۔ اسی لئے عشق کا والہانہ پن پھوٹ پھوٹ کر نکلنا چاہتا ہے۔ پھر اس پر بارہ لگام لگا دی جائیں، چھ ظاہر میں چھ باطن میں، تو اس کشمکش میں وہ روح، وہ والہانہ پن، وہ بے ساختگی، وہ جذبۂ بے اختیار شوق جکڑ سا جاتا ہے۔ مقیّد ہو کر گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ مگر کسی کے دستِ کرم کے طفیل ان بارہ لگاموں کا رخ مدینہ کی طرف کر دیا جائے تو جذبۂ بے اختیار اور سوا ہو جاتا ہے۔ مومن کی یہی شان ہے کہ دمِ شمشیر کی طرح سینۂ شمشیر سے باہر نکل آئے۔ حریف کی چمکتی ہوئی تلواروں میں بے اختیار ہو کر وصالِ محبوبؐ حاصل کر لے۔ اسی والہانہ جذبہ کی شدت میں تنظیم سے طبیعت الجھتی ہے۔ اگرچہ کائنات میں جو حسن نظر آتا ہے وہ اس کی ترتیب سے ہے۔ ساری کائنات اور حیات ایک تنظیم ہے، چاہے فرد کی ہو یا قوموں کی۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک جسم و جان کا تعلق ہے انسان کو تنظیم کی ضرورت ہے۔ مگر لازمان لامکان میں تو یہ وجودی بندشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک پھیلاؤ ایک کشادگی نصیب ہوتی ہے جو وحدت الوجود سے ہم آہنگی اور سرشاری کی کیفیت ہے۔ یہاں امرِ ربی کی کارفرمائی ہے۔ کوئی بے راہ روی نہیں، جس کے لئے نظام اور بندشوں کی ضرورت ہو۔ تنظیم ایک ہوش کی سطح تک کی بات ہے۔ مگر عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشاری اور اس عشق کا والہانہ پن، جمعیت کی روح کی حیات کی

بات ہے۔ حیُّ و قیُّوم کی تجلی ہے۔ جب یہ روح یہ والہانہ پن شدید ہوتو تنظیم غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ جیسے وقتِ جہاد، ایک جذبۂ شہادت سے سرشاری اور روز مرہ زندگی میں وہ جذبۂ فدائیت جس کا اظہار داتا دربار میں موجودہ تنظیم سے پہلے ہوتا تھا۔ وہ بظاہر ایک بے ہنگامی مگر اس کے پیچھے ایک والہانہ جذبہ تھا۔ ایک روح تھی جس کا مزہ آتا تھا۔ یا روز مرہ کی نماز جو بظاہر ایک تنظیم معلوم ہوتی ہے مگر اس کے پسِ پشت ایک جذبۂ ایثار کے والہانہ پن میں اخوّت کا رشتہ مضبوط کرنا ہے اور اس کا حقیقی مقصد جمعیت کی روح میں ایک توحید قائم کرنا ہے۔ یہی بات تھی کہ اسلام کے سادہ لوح مجاہد دن میں تنظیم کو برقرار رکھتے تھے، بہترین سپاہی یا مبلغ ہوتے تھے اور رات کو ایک عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والہانہ پن میں ہوتے تھے اور جانماز آنسوؤں سے تر ہوتی تھی۔ اس جذبۂ والہانہ کو قربِ نوافل کہہ لیں کہ محبوب سے عشق اپنی جگہ اور اس میں کوئی تحفہ، درود، سجدے، آنسو شکرانہ کے طور پر پیش کر دیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ اتنے نوافل کیوں ادا کرتے ہیں تو فرمایا، کیا مَیں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

تمام تاریخِ انسانی کو دیکھا جائے تو یہی والہانہ جذبہ، ان کی حیات کا ضامن رہا ہے۔ نشۂ جہاد میں انسان اللہ اور رسولؐ کے نام پر جان دیئے اٹھتا ہے ہزار فقیری، ہزار قلندری اس پر قربان۔ یہ ایک جذبۂ حیات ہے۔

"جَذْبَۃٌ مِنْ جَذْبَاتُ الْحَقُّ یَا حَیُّ یَا قَیُّومَ"

قرآن کریم ایمان اور عمل کی تلقین کرتا ہے۔ ایمان، والہانہ جذبہ ہے تو عمل تنظیم ہے۔ رشد و ہدایت ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ ظاہر میں ایک تنظیم مگر باطن میں ایک شوق و الہانہ جو اس تنظیم کی جان و روح ہے۔

خالی تنظیم کی بندشوں میں رہ کر یا تنظیم کا سہارا لے کر تو انسان سرد پڑ جاتا ہے۔ فی زمانہ قوم میں تصرفات کے ذریعہ ہی یہ والہانہ جذبہ قائم رہ سکتا ہے۔سالکین ہی میں یہ والہانہ پن اور تنظیم دونوں ایک میزان میں ہوتے ہیں۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ باطن کے چور دروازوں سے، قلوب میں ایک شوقِ والہانہ کو عام کر دیا جائے یہ شوق والہانہ صرف جہاد کے وقت ہی ابھرتا ہے ۔ جہاد ہی میں ایمان اَتَم ہوتا ہے اور عمل کامل بھی۔محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی حرمت پر مرمٹنا ہر مومن کا مطمحِ نظر ہوجاتا ہے۔

اسی عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمو کر حیٌّ و قیوم کے انوار نشر کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ کُنْ فَیَکُوْن کی ارتقائی شان میں رحمتِ محمدیؐ، فیضانِ محمدیؐ کے طفیل اُمت کی صبح درخشاں ہے۔فقرائے باطن کے لئے یہی قربِ نوافل کا وقت ہے۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حیُّ یا قیُّوم''

لمحۂ لاالحاقی (فنا للبقاء)

یکم دسمبر ۱۹۷۷ء صبح ۴ بجے لحاقی لا کا لمحہ۔ بلکہ لمحہ بھی بڑا وقت ہے یوں کہوں کہ جب کچھ نہ تھا تو وہ کون ہے جسے اس کچھ نہیں کا ہوش ہے۔ یہ وہی کُل ہوگا جو سب مظہروں سے، سب تخلیق سے، مکان زمان سے، حیات و نور سے ماوراء ہے۔ اس وقت کوئی تو نہیں ہے اس لئے کوئی بھی نہیں۔ نہ خالق ہے نہ مخلوق، نہ کوئی وجود، نہ ازل نہ ابد، نہ صفت نہ ذات، ہاں اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اسی لئے صبح یہ مصرع وردِ زبان تھا۔

بھول بھول کی یاد رہی میں کب بھولی تو ئے

کیا یہ انائے اکبر اور انائے اظہر کا توحیدی لحاقی لا کا لمحہ تھا۔ جسے لمحۂ

برق دش کہ لیں۔ ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' تک دوئی تھی فیکون، تخلیقِ کائنات کثرتِ صفات میں حجاب در حجاب بھی تھی اور ''کُلَّ یَومٍ هُوَ فِی شَان'' کے کیف میں اظہار در اظہار بھی۔ اپنی حقیقت تک بھی پہنچ کر دیکھا مگر حقیقت کا جو عین تھا، حق الحق تھا، اس کے مخرج کا مخرج نکتہ کہیں تو بھی کثیف، کوئی نام دیں تو کثیف، کیسی ذات کیسی صفات، کیسا اوّل کیسا آخر، یہ اَحد Oneness کی بات ہے، کُل کی بات ہے۔

اس کا ایقان اس کو ہی ہو سکتا ہے جو ذات صفات سے مبّرا ہو۔ یوں کہہ لو کہ ننگا قلندر ہو۔ یہ خالی ہونے کی بات نہیں، نہ گُم شُد اندر گُم شُدن کی بات ہے۔ یہ لمحہ لحاتی لا ہے۔ اس کا فنا سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ بقا جیسا قیام ہے۔ بس ایک جذب کا لمحہ ہے اور بڑا معنی خیز۔

کیا یہ لمحہ لا تھا جسے بھول کہہ لیں کہ جیسے نماز کی چوک کا خیال کہ لاشعور کے لاشعور میں یاد ہوتی ہے اور نماز کے ادا ہونے کے مقابلہ میں اس میں کہیں زیادہ شدت بے چینی اور معنی ہیں۔ یہ یاد کرنے والا اپنے کو یاد کرتا ہے۔ اسے ادھر سے دیکھوں ''اُنْظُر بِنُورِ الله'' دیکھو اللہ کے نور سے۔ اسی بھول کے بعد، قائم النور ہونے کے بعد صحیح حالات کا جائزہ ہو سکتا ہے۔

اَحْبَبْتُ کا جوش

کیا یہ وہ لمحۂ ارتعاش تھا جب ایک حباب ٹوٹتا ہے کہ نہ اسے حباب کہہ سکتے ہیں نہ سمندر۔ البتہ ہوش آتا ہے تو سمندر ہی سمندر۔ جیسے کہ کبھی سمندر سے جدا ہی نہ تھے۔ اللہ اکبر حباب کا ایک وجود خیالی تھا، عارضی تھا۔ دوئی بھی کہاں۔ دوئی بھی تھی تو مجازی۔ اب وجود تک بھی نہیں۔ ایک وجود کا

مفہوم ضرور ہے۔ یہ فہم بھی کہ وجود کیا تھا یا کیا ہوگیا، کہاں گیا۔ ایک بے معنی سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ سطحِ آب کی جس نازک سے نازک جھلی نے اسے وجود کا نام دے رکھا تھا وہ تک لا متناہیوں میں سمائی ہے۔ ایسے میں کیسا زمان، کیسا مکان، کیسا اول، کیسا آخر، کیسی صفات، کیسی ذات، اس لمحہ لا میں نہ خالق نہ مخلوق، نہ حیات نہ نور نہ تُو کا پتہ۔ اور جب تُو نہیں تو مَیں کا شعور تک کیسا۔ یعنی

نہ تو تُو رہا نہ تو مَیں رہا۔ جو رہی سو بے خبری رہی

مگر یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ نہ تھا۔ اور جو ہے اس سے کیسے انکار کیا جائے۔ مگر یہ جو کچھ ہوا اس کا کیف کس نے لیا۔ اس کا ہوش کسے ہوا۔ اسے انائے اکبر کا کیف کہہ لو۔ اَحبَبتُ کا جوش کہہ لو۔ اس ''اَحبَبتُ اَنْ اُعرَف'' کے کیف میں، ایک ذرۂ ہیچ در ہیچ کو لامتناہی وسعتوں سے ملا دو۔ اس قطرۂ لطیف در لطیف کو بحرِ ذخّار کا کیف دے دو۔ تو کچھ ہو نہ ہو اس کیف کی اکبریت کے مبارک حَول میں اللہ اکبر تو کہہ اٹھے گا۔

ایک زمانہ بیتا۔ صدیاں در صدیاں گزر گئیں۔ اس ہیچ در ہیچ قطرۂ آب کو بحرِ حقیقت سے جدا ہوئے۔ مگر اس جدائی میں ایک لمحہ سے بھی قلیل در قلیل وقت میں بھی کیا یہ کبھی اپنے اصل کو بھول بھی سکتا تھا۔ بھولتا بھی تو کیا ہوتا۔ کیا اس بھول سے حقیقت پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا۔ اَلآن کَمَا کَان۔ جیسا تھا ویسے کا ویسا رہا۔ یہ ہر انداز نو بہ نو یہ یاد قائم رہی۔ یا بھول بھی ہوئی، چوک بھی ہوئی تو اور تازیانہ کا کام دیا۔ لاشعور کے لاشعور کی ہزاروں گہرائیوں میں یہ یاد بجلی کی طرح اٹھ کر ہوش میں آئی اور شعور کو مزیّن کر کے اور شدتوں کا باعث بنی۔ ایسی بھول بھی مبارک جس میں اور شدتیں نصیب ہوں ان شدتوں میں، حبابِ

بیچ مقدار کی کیف آمیزیوں کا لطف لیں کہ جیسے ہی یہ لطیف خول ٹوٹا، تو وہی اوّلین جذبہ حق ''اَحبَبتُ اَن اُعرَف۔ حُب، حُب، حُب'' کیسا حسین اور مبارک لمحہ برق وش اور کیسی مبارک یاد ہے۔

طائر روح بھی گنگنا رہا ہے، بھول بھول کی یاد رہی میں کب بھولی تو ئے

روح کے لئے یہ وہ لمحہ مبارک تھا جسے تجلّی اکبر کہیں کہ جس پر اللہ اکبر کی تجلّی ہو جائے وہی جانتا ہے کہ عجز کسے کہتے ہیں۔ عجز عاشقوں کی میراث ہے۔ کبریائی کا زوج ہے عجز۔ یہ وہ لمحۂ مقبولیت ہے کہ جیسے کسی کا عقد ہو جائے تو حچب نکھر آتی ہے۔ ایمان کی طرح یہ بھی لمحاتی چیز ہے کہ ایک ہی بار میسّر ہوتا ہے اور بقیہ زندگی اسی کے شکرانے میں گذرتی ہے۔ جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور بقیہ زندگی آغوشِ مادر میں گذارتا ہے۔

عاجزی ان کی نشانی ہے جن کی آنکھ قدم بوسی میں جُھک جاتی ہے۔ آسمان سمٹ کر زمین کو آغوش میں لے لیتا ہے۔ پیشانی کے نیچے زمان مکان سمٹ کر ان پائے ناز پر آجاتے ہیں جس کو سجدہ ہو رہا ہوتا ہے (اپنی پہچان کا شوق ہوا تو نورِ محمدیؐ کی تخلیق کی) پھر ایسے سجدے سے کون سر اٹھا سکتا ہے۔

یہ لمحہ لاؔ خود لاتمنا ہی ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ اپنا ہوش نہ ہوش کا ہوش۔ یہ ایسا لمحہ لمحاتی لا ہے کہ جس کا نہ اوّل نہ آخر۔ نہ زمان نہ مکان بس ایک اللہ اکبر کا کیف کہ ہے۔ اب کہیں عاجزی کی بھی انتہا ہے۔ اکبریت کا ظلِ نورانی ہے۔ ایسی عاجزی کرنے کا بھی عاجز کو ہوش کہاں۔ کیسی عاجزی کیسا عاجز، جب اکبریت کی تجلّی ہو رہی ہو، تو دوئی اور غیر کی گنجائش کہاں۔ تو کہنے کا بھی مجاز کسے ہو۔ میں کہاں جو تُو کا ہوش ہو۔ یہ لالمحاتی ہے کہ ہوش ہے تو بس ہوش۔ واحدِ یکتا کو اب اَحبَبتُ ہی خود اَحبَبتُ کا کیف لے رہا ہے۔ اکبر ہی

کبریائی کی شان بنا ہے۔ اکبریت ہی عجز کی چھب میں جلوہ گر ہے۔ اسی لمحہ لحاتی لا میں ہوش ہی ہوش ہے۔ بھول بھول کی دیا ہے۔ یہ قلندر ِ باہوش کا مقام ہے جو کہہ سکے کہ

بھول بھول کی یاد رہی میں کب بھولی تو ئے

یہ وہ لمحہ ہے جو حق تھا۔ تخلیق سے پہلے جیسے کسی عمارت کا نقش جو دماغ میں تھا۔ وہ عمارت سے کہیں زیادہ حقیقت رکھتا ہے۔ یہاں سب سے پہلے نتیجہ آتا ہے۔ ایک دفعہ اس لمحہ کا تجربہ ہو جائے، تب کہیں کل کا تجربہ ہوتا ہے، تب کہیں عقلِ کُل، علم کُل کی بات ہوتی ہے۔ یہ وہ لمحہ معنی خیز ہوتا ہے جب راکٹ، چلنے سے پہلے شتابہ ختم ہو کر چلنا ہوتا ہے کہ اس لمحہ میں نہ شتابہ ہے نہ راکٹ بس نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔ یہ وہی لمحہ ہے جو مشیت الٰہی کا وجود میں اظہار ہونے سے پہلے لمحہ لا تھا۔ حق کے مقام سے حق کی زبان سے کُن فیکُون ہے۔ بلکہ یہ لمحۂ کن فیکون سے لا پہلے کی بات ہے۔

یہ قبلِ ظہور، حیات و نور سے ماوراء وہ عالم ہے جہاں ابھی نہ صفت ہے نہ ذات۔ لمحہ لا انائے اکبر کی وہ دمک ہے، جو نورِ اسودی کے بطن میں، صورِ فنا بنی ہے اور لقائے ذات کی حشر سامانیاں لے آئی ہے۔ یہ نورِ اسودی میں شوقِ خود شناسی کی برق وش لپک، ایک لحاتی لا ہے۔ یہ بقا میں ہوتے ہوئے، کسی پہ فدا ہو جانے کی تڑپ ہے۔ نورِ محمدیؐ کی تخلیق ہوا چاہتی ہے۔

نورِ محمدیؐ ابھی سیہ نور کی اکبریت کے مبارک خول میں ملفوف ہے اسودی نور کی یہ دمک، نورِ محمدیؐ کا ظہورِ جاریہ بن گئی ہے۔

اللہ اکبر۔ اس شان کی آمد کی توقیر کے لئے یہ لحاتی لا ہوتی ہے۔ بتیاں گُل کر دی گئی ہیں اور نورِ محمدیؐ کا اجالا ہو رہا ہے۔ اب اس نازشِ

تخلیق کی معجز نمائی شمعِ محفل بن کر ، جمالِ حسنِ ذات کھلا رہی ہے۔ اب باطن نے ظاہر کو سجدہ کیا ہے۔

نورِ اسودی کی اس لمحاتی فنا نے، اکبریت کے آگے، عبدہٗ کا رُوپ دھارا ہے۔ یہی فنا کا تحفہ نذرِ حُسنِ للبقاء ہوا ہے۔عبد بن کر حُسن نے عشق کی شرم رکھ لی ہے کہ اکبریت اسی کو زیب دیتی ہے۔ اس پُر نور لمحے، اس فنا للبقاء کی یاد،صرف اس نورِ محمدیؐ کے بطن میں باقی رہ گئی ہے جسے یہ تو یاد تھا ہی کہ اوّل میرا نور پیدا کیا گیا اب اس سے بھی پہلے والی بھولی بات یاد آ گئی ہے۔

ابھی تک فنا کی وہ اوّلین، قدیم ترین جھپکی کی یاد باقی ہے، جب بقا میں غوطہ زن رہتے ہوئے لمحاتی لا ہوئی تھی۔ تب ہی تو تمام خلقت میں سنّتِ جاریہ،لمحاتی فنا کے بعد، دائمی بقا کی عمل پیرائی ہے وہ ماں کی گود،نورِ اسودی، وہ جھولے کا جھلکا لحہ لا، اب بھی یاد ہے۔ جس نے ہوش میں، اس لامتناہیت میں، فنا کی جھپکی لی وہ بقا میں زندہ جاوید ہوا۔ اس کے لئے اب دوسری موت نہیں۔ یہ فنا للبقاء والا، اب نورِ محمدیؐ میں پایندہ ہے۔

وَیَبقٰی وَجهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

❁❁❁❁